

فقہائے تابعین کی اہل حدیث اور اہل رائے میں تقسیم

ایک تنقیدی جائزہ [1]

عصر حاضر میں فقہ اسلامی کی مرحلہ وار، مربوط اور مرتب تاریخ پر قابل قدر علمی کام ہوا ہے اور خاص طور پر عالم عرب سے فقہ اسلامی اور مذاہب فقہ کے تعارف و تاریخ پر مشتمل انتہائی اہم کتب سامنے آئی ہیں۔ فقہ اسلامی کی تجدید، احیاء اور نئے مسائل میں مختلف مکاتب فکر سے اخذ و استفادہ کو آسان بنانے میں ان کتب کا بڑا اہم اور بنیادی کردار ہے۔ ان کتب کی افادیت اور اہمیت اپنی جگہ، لیکن ان میں تاریخی حوالے سے مختلف عوامل کی بنیاد پر بعض تسامحات بھی سامنے آئے ہیں اور بلا تحقیق نقل و نقل کی وجہ سے وہ تسامحات کافی مشہور ہوئے۔ ان تسامحات میں ایک اہم تاریخی فروگزاشت پر کچھ محرومات پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

فقہ اسلامی کے مختلف مناہج تاریخ فقہ کا ایک اہم باب ہے۔ تدوین فقہ کے دور میں اسلامی ممالک کے مختلف شہروں سے قابل قدر مجتہدین اٹھے، ہر مجتہد نے اپنے گرد و پیش کے حالات، اپنے ذوق اور اساتذہ کے اسلوب کے مطابق اپنے اصول استنباط و استخراج وضع کیے، ان میں خاص طور پر اہل عراق اور اہل حجاز کے مکاتب فقہیہ میں استنباط و استخراج کے اصولوں میں واضح اور نمایاں فرق تھا۔ اس فرق کی بہت سی وجوہ ہیں، لیکن بعض تاریخی اسباب کی بنا پر یہ مشہور ہو گیا کہ مکتب عراق و حجاز میں جوہری فرق رائے و روایت کا تھا۔ اول الذکر مکتب میں رائے کو بنیادی حیثیت حاصل ہونے کی وجہ سے اہل الرائے اور ثانی الذکر مکتب میں آثار کو مرکزی حیثیت حاصل ہونے کی وجہ سے اہل حدیث کہا جاتا ہے۔ اس مقالے میں درج ذیل پہلوؤں سے اس تاریخی مغالطے پر بحث کی گئی ہے:

- اس تقسیم کے اولین قائلین کی تعیین
- معاصرین میں سے اس تقسیم کے قائلین
- اس تقسیم کے سلسلے میں بیان کیے جانے والے بنیادی اسباب کا ناقدا نہ جائزہ
- عراق میں احادیث کے ذخیرے کا ایک جائزہ
- حجازی و عراقی مکاتب حدیث کا ایک دوسرے سے اخذ و استفادہ
- حجاز میں رائے و قیاس کی کثرت اور اس کے استعمال کے شواہد

و حجازی و عراقی مکاتب کی اولین کتب فقہیہ کا رائے و اجتہاد کے حوالے سے موازنہ

- اہل حدیث اور اہل رائے کی اصطلاحات کے مختلف مفہیم اور ان کا ارتقائی جائزہ

فقہ اسلامی کی تاریخ پر مشتمل اکثر کتب میں دور تابعین میں اہل حدیث اور اہل رائے کے نام سے فقہاء کے دو بڑے گروہ بنائے گئے ہیں، اہل عراق کو اہل رائے کا سرخیل قرار دیا گیا ہے، جبکہ اہل حدیث کی جائے نشوونما خطہ حجاز کو ٹھہرایا گیا ہے۔ ان دونوں مناہج اور مکاتب فکر میں اساسی و بنیادی فرق اس بات کو قرار دیا گیا ہے کہ اہل رائے نصوص میں تعلیل اور غیر منصوص مسائل میں قیاس و اجتہاد پر زور دیتے تھے، جبکہ اہل حدیث کا بنیادی وصف نصوص کی بلا تعلیل پیروی کرنا اور غیر منصوص مسائل میں حتی الامکان اجتہاد اور قیاس سے اپنے آپ کو دور رکھنا تھا۔ منہج کے اس اختلاف کے اسباب اور عوامل پر بھی معاصر کتب میں گفتگو کی گئی ہے۔*

چنانچہ فقہ اسلامی کی تاریخ کی جدید اسلوب میں داغ نیل ڈالنے والے معروف مورخ شیخ خضریٰ بک اپنی مایہ ناز کتاب تاریخ التشریح الاسلامی میں لکھتے ہیں:

وجد بذلك اهل حدیث و اهل رای، الاولون یقفون عند ظواهر النصوص بدون بحث فی عللها و قلما یفتون برای، و الاخرون یبحثون عن علل الاحکام و ربط المسائل بعضها ببعض و لا یحجمون عن الرای اذا لم یکن عندہم اثر، و کان اکثر اهل الحجاز اهل حدیث و و اکثر اهل العراق اهل الرای
”ان اسباب کی بنا پر اہل حدیث اور اہل رائے وجود میں آئے، اہل حدیث نصوص میں علتیں نکالنے کے بغیر ان نصوص کے ظاہری مفہوم پر ٹھہرتے اور (نص نہ ہونے کی صورت میں) قیاس سے بہت کم فتویٰ دیتے۔ جبکہ اہل رائے احکام کی علتوں کو تلاش کرتے تھے اور غیر منصوص مسائل کو ان معلول بالعلت مسائل کے ساتھ (قیاس کے ذریعے) جوڑتے تھے، نص نہ ہونے کی صورت میں قیاس و اجتہاد سے کسی قسم کی کنارہ کشی اختیار نہ کرتے تھے۔ اہل حجاز کے اکثر فقہاء اہل حدیث منہج اور عراقی فقہاء اہل رائے کے منہج پر تھے۔“
شیخ خضریٰ بک کی طرح مذکورہ نظریہ علامہ حوی نے الفکر السامی فی تاریخ الفقہ الاسلامی میں، شیخ مناع القطان نے

* اس سلسلے میں سابقہ علمی کام:

۱- مدرسة الحدیث فی الکوفة، از الدكتور شرف محمود

۲- عصر التابعین از عبدالمعزم الہاشمی

۳- الاتجاهات الفقہیة عند اصحاب الحدیث فی القرن الثالث الهجری از عبدالمجید محمود

۴- مجلہ جامعۃ الملک سعود میں الدكتور حمدان کے بعض مقالات

۵- الرای و اثره فی الفقہ الاسلامی از الدكتور ادریس جمعہ

۶- مشہور فقہیہ خلیفہ بکر الحسن کی گرانقدر کتاب: الاجتہاد بالرای فی مدرسة الحجاز الفقہیة

۷- ابو بکر اسماعیل محمد میقاتی کی کتاب: الرای و اثره فی مدرسة المدینة

ماہنامہ الشریعہ _____ ۳۹ _____ اکتوبر ۲۰۱۶

تاریخ التشریح الاسلامی میں، الدكتور صالح الرفوف نے تاریخ الفقہ الاسلامی میں، دکتر عبدالوہاب الخلاف نے خلاصہ تاریخ التشریح الاسلامی میں، الدكتور عبدالکریم زیدان نے المدخل الی دراستہ الشریعہ الاسلامیہ میں، شیخ ابو زہرہ مرحوم نے محاضرات فی تاریخ اہل ہندوستان کے مشہور عالم مولانا ارسلان رحمانی نے "فقہ اسلامی، تعارف و تاریخ" میں بیان کیا ہے۔ مذکورہ حضرات سے پہلے اہل رائے اور اہل حدیث کی تقسیم شہرستانی نے لامل و النحل میں، ابن خلدون نے الشہرستانی کی پیروی کرتے ہوئے تاریخ ابن خلدون میں اور مسند الہند امام شاہ ولی اللہ نے الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف میں اپنے پیشروں کی تقلید میں اختیار کی ہے، البتہ ہر سہ حضرات نے بغایت اختصار اس بات کو بیان کیا ہے، لیکن معاصر مورخین نے اسباب و عوامل کے تناظر میں تفصیلاً اس نظریے پر خامہ فرسائی کی ہے۔

اہل حدیث اور اہل رائے کی تقسیم کے اسباب و عوامل کا ناقدانہ جائزہ

اب ہم ان حضرات کے بیان کردہ اسباب و عوامل پر ایک ناقدانہ نظر ڈالنا چاہتے ہیں:

بنیادی طور پر اس سلسلے میں تین اسباب بیان کئے جاتے ہیں:

۱: فقہائے صحابہ کی منہج اجتہاد و قیاس کے اعتبار سے تقسیم

۲: عراق میں احادیث و روایات کی قلت اور حجاز میں کثرت

۳: عراق میں اجتہاد دورائے کی کثرت اور حجاز میں قلت

سبب اول: فقہائے صحابہ کی منہج اجتہاد و قیاس کے اعتبار سے تقسیم

مذکورہ تقسیم کے قائلین کی نظر میں اس تقسیم کا سب سے بڑا اور بنیادی سبب یہ تھا کہ خود صحابہ کرام کے منہج اجتہاد میں اختلاف تھا۔ بعض صحابہ کرام رائے، قیاس اور اجتہاد سے حتی الامکان اپنے آپ کو بچاتے تھے اور صرف نصوص کے ظاہری مفہوم پر اکتفاء فرماتے، جبکہ دوسری طرف ایسے صحابہ بھی تھے جن پر احکام کی علتیں نکالنے کا ذوق غالب تھا اور غیر منصوص مسائل میں وسعت کے ساتھ اجتہاد و قیاس سے کام لیتے اور اسی کے اثرات فقہائے تابعین تک پہنچے اور یوں فقہاء کے دو بڑے گروہ اور قیاس و اجتہاد کے دو بڑے منہج سامنے آئے۔ الدكتور رمضان علی سید اپنی کتاب المدخل لدراسۃ الفقہ الاسلامی میں لکھتے ہیں:

تأثرهم بطریق شیوخہم کزید بن ثابت و ابن عمر و ابن عباس اذا کان ہولاء یتمسکون بالا حدیث و یخافون من استعمال الراۃ تورعا و احتیاطا لدینہم
 ”اہل مدینہ اپنے شیوخ کے طریقہ سے متاثر تھے، جیسے زید بن ثابت، حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس، کیونکہ یہ لوگ احادیث سے تمسک کرتے تھے اور رائے و قیاس کے استعمال سے تقویٰ اور دین داری کی وجہ سے ڈرتے تھے۔“

اس سبب کے بارے میں چند گزارشات

۱: دور تابعین میں اگرچہ صحابہ نے خاص خاص شہروں میں مسند تدریس سنبھالے، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں

ہے کہ جس شہر میں جس صحابی نے ڈیرے ڈال دیے، صرف اسی شہر کے مکین ہی ان سے استفادہ کرتے، بلکہ اس وقت تو طلب علم کے لئے رحلت اور مختلف شہروں میں حصول علم کے لئے سفر کا رواج عروج پر تھا، تشنگان علم در در کی خاک چھانتے، اور جس شہر کے بارے میں کسی صاحب علم کے بارے میں سنتے تو اسی کی طرف کوچ کر جاتے، چنانچہ مدینہ کے معروف تابعین کا سلسلہ تلمذ جس طرح مدینہ میں مکین صحابہ، حضرت زید بن ثابت، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت ابن عباس، حضرت ابو ہریرہ اور حضرت عائشہ تک پہنچتا ہے، اسی طرح ملک عراق و شام کے اکابر تابعین نے بھی مدینہ کے ان درگاہوں سے کسب فیض کیا، یہی وجہ ہے کہ عراق کے معروف فقہاء علقمہ بن قیس، مسروق بن الاعدع، اسود بن یزید، عامر بن شراحیل الشعمی اور دیگر تابعین کے اساتذہ میں حضرت زید، حضرت عائشہ اور حضرت ابن عمر کے نام سرفہرست ہیں۔ اسی طرح مدینہ کے بعض تابعین کا دیگر امصار کے صحابہ سے کسب فیض معروف بات ہے، ابن حزم اپنی کتاب الاحکام میں لکھتے ہیں:

وہکذا صحت الاثار بنقل التابعین من سائر الامصار عن اهل المدینہ و بنقل التابعین من اهل المدینہ و من بعدهم عن اهل الامصار فقد صحب علقمة و مسروق و عمر و عثمان و عائشة ام المومنین و اختصوا بہم و اکثروا الاخذ منہم ”اسی طرح معروف شہروں کے تابعین کا مدینہ والوں سے روایات لینے کے بارے میں صحیح آثار موجود ہیں، اور ایسے ہی مدینہ کے تابعین اور تبع تابعین کا دیگر اہل بلاد سے استفادہ کرنے کے بارے میں بھی روایات موجود ہیں۔ یہ بات ثابت ہے کہ (کوفہ کے اکابر تابعین جیسے) علقمہ اور مسروق نے (مدینہ کے اکابر صحابہ) حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت عائشہ کی صحبت اختیار کی، ان سے خصوصیت سے استفادہ کیا اور ان سے بہت ساری چیزیں حاصل کیں۔“

جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ مدینہ میں مقیم صحابہ سے ہر شہر خصوصاً اہل کوفہ کے اکابر تابعین نے خوب استفادہ کیا ہے، تو اس صورت میں یہ کہنا کسی صورت درست نہیں بنتا کہ مدینہ والوں کے منہج میں ان کے اساتذہ صحابہ کا اثر تھا۔ اگر معاصر حضرات کا مذکورہ نظریہ مان لیا جائے تو ایک معقول سوال اس موقع پر ذہن میں آتا ہے کہ انہی اساتذہ سے تو کوفہ کے تابعین نے بھی استفادہ کیا تو ان پر رائے کی تقلیل اور اجتہاد و قیاس سے کنارہ کشی کا اثر کیوں نہیں پڑا؟ ایک ہی طرح کے اساتذہ سے حصول علم کے بعد منہج میں فرق کی نسبت اساتذہ کی طرف کرنا علمی حوالے کوئی مضبوط بات نہیں ہے۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعود جو متفقہ طور پر اجتہاد و قیاس کی کثرت کے حوالے سے معروف ہے، ان کے تلامذہ میں صرف اہل کوفہ نہیں تھے، بلکہ مدینہ، شام اور بصرہ کے اکابر تابعین نے ان سے استفادہ کیا۔

۲: مدینہ میں مقیم صحابہ خصوصاً حضرت زید بن ثابت، حضرت ابن عمر، حضرت ابن عباس اور حضرت عائشہ کے بارے میں بات کرنا کہ وہ رائے و اجتہاد سے احتیاط کرتے تھے اور نصوص کے ظاہری مفہوم پر ہی اکتفاء کرتے تھے، محل نظر ہے۔ ان صحابہ کرام کی فقہی آراء سے کتب احادیث بھری پڑی ہیں، اور خصوصیت کے ساتھ بکثرت ایسی روایات موجود ہیں جن میں ان حضرات نے غیر منصوص مسائل میں قیاس و اجتہاد سے کام لیا اور بعض واقعات میں ان حضرات کا اجتہاد نصوص میں تغلیل پر بھی مبنی ہوتا ہے۔ ان میں سے بعض صحابہ کرام کی فقہی آرا پر باقاعدہ ضخیم موسوعات بھی تیار

ہو چکے ہیں۔ ابن قیم نے اعلام الموقعین میں ان صحابہ کی فہرست دی ہے، جن سے بکثرت فتاویٰ منقول ہیں، ان میں مدینہ میں مقیم یہ چاروں صحابہ سرفہرست ہیں، چنانچہ لکھتے ہیں:

وكان المكثرون منهم سبعة، عمر بن الخطاب، وعلی بن ابی طالب، وعبد اللہ بن مسعود، وعائشہ ام المومنین، وزید بن ثابت، وعبد اللہ بن عباس، وعبد اللہ بن عمر

”صحابہ میں وہ حضرات جن سے سب سے زیادہ فتاویٰ منقول ہیں، وہ سات حضرات ہیں: حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عبد اللہ بن مسعود، حضرت عائشہ، حضرت زید بن ثابت، حضرت عبد اللہ بن عباس اور حضرت عبد اللہ بن عمر۔“

فتویٰ میں قیاس واجتہاد کا استعمال ایک لازمی امر ہے۔ اگر یہ مفروضہ مان لیا جائے کہ یہ صحابہ کرام اجتہاد و قیاس سے بچتے تھے تو فتاویٰ کی مقدار میں وہ حضرت ابن مسعود اور حضرت علی کے درجے تک کیسے پہنچے، جن کے بارے میں اتفاق ہے کہ بکثرت اجتہاد و قیاس سے کام لیتے تھے؟

اس کے علاوہ ان حضرات نے ایسے مواقع پر بھی تعلیل سے کام لیتے ہوئے اجتہاد کیا، جن میں ان کا اجتہاد نص کے ظاہری مفہوم کے معارض ہوتا، چنانچہ حضرت عائشہ کا عورتوں کے مساجد میں آنے سے متعلق اجتہاد معروف و مشہور ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی صریح حدیث کے ہوتے ہوئے انہوں نے عورتوں کے مسجد جانے پر نکیر فرمائی تھی، حالانکہ حدیث میں ان کو مسجد میں آنے کی صریح اجازت دی گئی تھی، لیکن حضرت عائشہ کا فتویٰ یہ تھا کہ یہ اجازت خاص شرائط کے ساتھ مشروط ہے۔ گویا تعلیل کے ذریعے نص کا عام مفہوم خاص محل پر محمول کیا۔ اسی طرح حضرت ابن عباس کا معارضہ کتب احادیث میں منقول ہے کہ جب حضرت ابو ہریرہ نے یہ حدیث بیان کی کہ آگ پر پکی ہوئی چیز سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، تو آپ نے فرمایا کہ اگر میں گرم پانی سے وضو کروں تو میرے وضو کا کیا حکم ہوگا؟ جس پر حضرت ابو ہریرہ نے ناراض ہوتے ہوئے فرمایا:

يا ابن اخي اذا سمعت حديثا عن رسول الله صلى الله عليه وسلم فلا تضرب له مثلا

”اے بھتیجے جب نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث آجائے تو اس کے لئے (معارضہ کے طور پر) عقلی مثالیں نہ دیا کرو۔“

غرض کتب احادیث میں ان حضرات کے اجتہادات اور قیاسات بکثرت مروی ہیں جن میں ان حضرات نے نصوص میں تعلیل سے وسیع پیمانے پر کام لیا۔ یہی وجہ ہے کہ عصر حاضر میں ان حضرات کے فتاویٰ اور اجتہادات پر ضخیم جلدات وجود میں آچکی ہیں۔ ان اجتہادات کے ہوتے ہوئے یہ کہنا کہ یہ قیاس واجتہاد سے بچتے تھے، محل نظر ہے۔

۳۔ ان حضرات کے بارے میں قیاس واجتہاد سے کنارہ کشی کے نظریہ کی بنیاد دراصل وہ روایات ہیں جن میں ان حضرات کا اتباع سنت، نصوص پر سختی کے ساتھ جمنا اور حتی الامکان فتویٰ کی ذمہ داری سے بچنا منقول ہے، چنانچہ امام دارمی نے سنن دارمی میں باب من هاب الفتيا کے نام سے باقاعدہ ایک باب باندھا ہے جس میں ان روایات

کو ذکر کیا ہے جن میں صحابہ و تابعین سے فتویٰ کے بارے میں احتیاط اور اس عظیم ذمہ داری سے حتی الامکان بچنے کا ذکر ہے، لیکن اس قسم کی روایات صرف ان مدنی صحابہ سے منقول نہیں ہیں، بلکہ فتویٰ واجتہاد کے حوالے سے معروف صحابہ جیسے حضرت ابن مسعود، حضرت علی اور حضرت عمر سمیت اکابر تابعین سے بھی اس قسم کے اقوال مروی ہیں، چنانچہ سنن دارمی میں حضرت ابن مسعود کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے:

من افتی عن کل ما یسال فھو مجنون

جو آدمی (سوال کی نوعیت سے صرف نظر کرتے ہوئے) ہر پوچھی ہوئی چیز کے بارے میں فتویٰ دے تو وہ

مجنون ہے۔“

بلکہ امام دارمی نے ابن ابی لیلیٰ سے صحابہ کا فتویٰ کے بارے میں عمومی نظریہ یوں نقل کیا ہے:

لقد ادرکت فی هذا المسجد عشرين و مائة من الانصار۔ ولا یسئل عن فتیاء الا و دان اخاه کفاه الفتیا

”میں نے انصار صحابہ میں سے ایک سو بیس ایسے اصحاب پائے ہیں کہ جب ان میں سے کسی سے کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تو اس کی خواہش ہوتی کہ اس کا بھائی اس کی طرف سے اس فتویٰ میں کفایت کر لے، یعنی وہ اس کی طرف سے یہ فتویٰ دے۔“

حضرت شاہ ولی اللہ الانصاف میں حضرت ابن مسعود کی فتویٰ کے بارے میں احتیاط نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

سئل عبد الله بن مسعود عن شیء، فقال: انی لا کره ان احل لك شیء حرمه الله عليك، او احرم ما احله الله لك

”حضرت ابن مسعود سے کوئی مسئلہ پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ میں ناپسند کرتا ہوں کہ اللہ کی حرام کردہ اشیاء

کو تیرے لئے (اپنے فتویٰ سے) حلال کر دوں یا حلال چیزوں کو (فتویٰ سے) تیرے اوپر حرام کر دوں۔“

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ الدکتور محمد الدسوقی "مقدمہ فی دراستہ الفقہ الاسلامی" میں لکھتے ہیں:

وقد وجد فی کل من المدرستین من هاب الفتیا و انقبض عنها اذا لم یکن فی حکمها اثر محفوظ، کما وجد فی کلتیہما من من جرء علی الفتیا و استخدم عقله فی التخریج و القیاس

”ہر دو مکاتب فکر میں ایسے افراد پائے جاتے تھے، جو فتویٰ دینے سے احتیاط کیا کرتے تھے، اور خاص طور

پر ان مسائل میں فتویٰ دینے سے رکتے تھے، جن میں متقدمین کے اقوال میں سے کوئی قول نہ ہو۔ اس کے

برعکس دونوں مکاتب میں وہ لوگ بھی موجود تھے جو فتویٰ کے حوالے سے جرات رکھنے والے اور مسائل کی

تخریج اور ایک دوسرے پر قیاس کرتے وقت عقلی مقدمات سے کام لیتے تھے۔“

لہذا جب فتویٰ میں احتیاط مدینہ میں مقیم صحابہ کی بجائے تمام معروف فقہاء صحابہ کا عمومی عمل تھا، خواہ کسی بھی شہر سے

تعلق ہو، تو اس بنیاد پر یہ فیصلہ کیسے کیا جاسکتا ہے کہ مدینہ میں مقیم صحابہ فتویٰ واجتہاد سے بچتے تھے اور دیگر صحابہ خاص کر

عراق میں موجود صحابہ قیاس واجتہاد سے زیادہ کام لیتے تھے؟

سبب دوم، عراق میں احادیث کی قلت اور حجاز میں کثرت

اہل رائے اور اہل حدیث کی تقسیم کا دوسرا بڑا سبب عام طور پر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ چونکہ عراق میں احادیث و روایات حرین شریفین سے دور ہونے کی وجہ سے حجاز کی بہ نسبت کم تھیں، اس لئے اہل عراق اجتہاد و قیاس میں رائے پر زیادہ انحصار کرتے تھے، جبکہ دوسری طرف حجاز خصوصاً مدینہ قلب اسلام ہونے کی بنیاد پر کثیر صحابہ کا مسکن تھا، اس لئے وہاں روایات کی تعداد کافی زیادہ تھی، اور اہل مدینہ کو خصوصاً میں عام طور پر مسائل مل جاتے تھے، اس لئے وہ اہل عراق کی بہ نسبت رائے پر بہت کم اعتماد کرتے تھے۔ محقق تظان اہل رائے اور اہل حدیث کے وجود میں اسباب کے ذیل میں لکھتے ہیں:

كان الحديث في العراق قليلا اذا ما قيس الى ما لدى الجاز
”عراق میں حجاز کی بہ نسبت احادیث کم تھیں۔“

اس سبب کے بارے میں چند گزارشات پیش خدمت ہیں:

1: اگر ایک لمحے کے لئے اس مفروضے کو تسلیم بھی کر لیا جائے کہ عراق میں احادیث کی قلت تھی، تو بھی اہل رائے اور اہل حدیث کی تقسیم میں یہ عامل اثر انداز نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ دور تابعین اور تبع تابعین میں طلب حدیث کے لئے رحلت اور اس کے لئے سفر ایک لازمی جزو سمجھا جاتا تھا، مختلف شہروں میں علم حدیث کے لئے جانے کا رواج کچھ اس کثرت سے تھا کہ محدثین کو رحلتی طلب الحدیث پر باقاعدہ کتب لکھنی پڑیں، چنانچہ خطیب بغدادی صاحب کی اس موضوع پر ضخیم کتاب الرحلة فی طلب الحدیث معروف و مشہور ہے۔ اس میں انھوں نے مختلف بلدان کی طرف محدثین کے اسفار کو بیان کیا ہے۔ اور خاص طور پر مدینہ مرکز اسلام ہونے کی وجہ سے علمی اسفار کے لیے بہت معروف تھا، یہاں تک کہ اندلس جیسے دور دراز کے علاقے سے بھی کافی کثیر تعداد میں محدثین مدینہ میں طلب حدیث کے لیے آتے تھے، تو عراق جو اندلس کی بہ نسبت مدینہ کے کافی زیادہ قریب تھا، یہ کیسے ممکن ہے کہ وہاں سے محدثین طلب حدیث کے لیے مدینہ کی طرف نہ گئے ہوں۔

ابن سعد نے اپنی معروف کتاب الطبقات الکبریٰ میں کوفہ، بصرہ اور بغداد کے ان محدثین کا مفصل تذکرہ کیا ہے جنہوں نے مدینہ میں حضرت عمر، حضرت ابن عباس، حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابن عمر سے احادیث لی ہیں۔ جلد ہشتم اور جلد نهم میں ان تین شہروں کے اکابر محدثین کا تذکرہ ہے جنہوں نے مدینہ میں مقیم صحابہ سے روایات لیں، خصوصاً حضرت عبداللہ بن مسعود کا کوئی ایسا معروف شاگرد نہیں ہے جس نے حضرت عمر اور دیگر صحابہ سے روایات لینے کے لئے مدینہ کا سفر نہ کیا ہو۔ اس لئے اگر عراق میں احادیث کی قلت مان بھی لی جائے تو محدثین نے مدینہ کے صحابہ کے پاس موجود روایات مدینہ میں جا کر ان سے حاصل کیں، تو کیا اس صورت میں اہل مدینہ کی اہل عراق پر حدیث پر فوقیت کا دعویٰ کیا جاسکتا ہے؟ بلکہ اس میں تو اہل عراق کو ایک گونہ فوقیت مل گئی کہ وہ دونوں شہروں کی روایات کے جامع تھے، کیونکہ مدینہ کی طرف تو سفر حدیث کا رجحان تھا، لیکن اہل مدینہ کا مدینہ سے خروج بہ نسبت اور شہروں کے کم تھا۔ اس کے علاوہ امام ابو حنیفہ کے دو مایہ ناز شاگرد اور فقہ حنفی کے ابتدائی دو بنیادی ستون امام ابو یوسف اور امام محمد کا مدینہ کی طرف اخذ حدیث کے لئے سفر اور وہاں کئی سال تک مقیم رہ کر اہل مدینہ کی روایات کو جمع کرنے کا عمل معروف ہے۔ ان

اسباب کی بنا پر الہدٰی کتب خانہ نے "مدرسة الحديث في الكوفة" میں لکھے ہیں:
 فقد كانت المدينة اهم المراكز العلمية التي ساهمت في تاسيس المدرسة
 الحديثية في الكوفة
 ”یقیناً مدینہ تمام مراکز علمیہ سے اہم ترین مرکز تھا، جس کا کوفہ میں مکتب حدیث کی تشکیل میں بنیادی کردار
 تھا۔“

۲: عراق میں قلت حدیث کا دعویٰ علم حدیث کی تاریخ کی رو سے ایک نہایت کمزور اور بے بنیاد دعویٰ ہے۔ اس
 وقت کے مراکز علمیہ میں کوفہ، بصرہ اور بغداد اہم ترین مراکز سمجھے جاتے تھے، اور کوئی ایسا قابل ذکر محدث نہیں ملتا جس
 نے عراقی درسگاہوں سے فیض حاصل نہ کیا ہو۔ حدیث کی معروف کتب کے مصنفین میں سے تقریباً ہر ایک نے طلب
 حدیث کے لئے عراق خصوصاً کوفہ کا سفر کیا، امام بخاری نے بخارا سے، امام نسائی نے خراسان سے، امام ابو داؤد نے
 سجستان سے، امام ترمذی نے ترمذ سے، امام ابن خزیمہ نے نیشاپور سے، مستدرک حاکم کے مصنف نے امام حاکم نے
 نیشاپور سے اور دیگر دور دراز کے محدثین نے طلب حدیث کے لئے عراق کا سفر کیا۔ اس کے علاوہ خود عراق سے علم
 حدیث کے وہ آفتاب طلوع ہوئے، جن کی علمی چمک سے اب تک علم حدیث جگمگا رہا ہے۔ عبدالرحمن بن مہدی، محمد
 بن سیرین، یحییٰ بن سعید القطان، ابو داؤد الطیالسی، امام احمد بن حنبل، خطیب بغدادی، امام دارقطنی، یحییٰ بن معین، عامر
 شعبی، ابواسحاق السبئی، امام اعمش، مسعر بن کدام، منصور بن المعتمر، سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، وکیع بن الجراح،
 یحییٰ بن آدم، ابو بکر بن ابی شیبہ، سعید بن جبیر، اور علم حدیث کے دیگر روشن ماہتاب عراقی درسگاہوں سے ہی طلوع
 ہوئے۔ یہ وہ حضرات ہیں، جن کے تذکرے بغیر علم حدیث کی تاریخ نامکمل سمجھی جاتی ہے۔ مشیت از خردارے کے طور پر
 چند معروف نام پیش کئے، ورنہ الطبقات الکبریٰ کی دو جلدیں صرف عراقی حفاظ و محدثین کے تذکرے پر مشتمل ہیں جس
 سے عراق میں حدیث و محدثین کی کثرت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

۳۔ جن محدثین نے طلب حدیث کے لئے عراق کا سفر کیا، ان کے تاثرات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حدیث و
 محدثین کی کثرت اور علمی درسگاہوں کی بہتات میں عراق کے تین بڑے شہروں، کوفہ، بصرہ اور بغداد کا ثانی نہیں تھا،
 چنانچہ سر تاج محدثین امام بخاری اپنے علمی اسفار گناتے ہوئے فرماتے ہیں:

دخلت الى الشام و مصر و الجزيرة مرتين، و الى البصرة اربع مرات، و اقامت
 بالحجاز ستة اعوام، و لا احصى كم دخلت كوفة و بغداد مع المحدثين
 ”میں طلب حدیث کے لئے شام، مصر اور جزیرہ میں دو مرتبہ گیا، بصرہ کا چار مرتبہ چکر لگایا، جبکہ حجاز میں چھ
 سال مقیم رہا، لیکن میں شمار نہیں کر سکتا کہ محدثین کے ساتھ کتنی بار بغداد اور کوفہ گیا۔“

قافلہ محدثین کے اس عظیم سالار کے اس فرمان سے کوفہ و بغداد کی حدیث کے حوالے سے شہرت اور اہمیت کا اندازہ
 لگایا جاسکتا ہے۔ نیز محدثین کا لفظ بتا رہا ہے کہ بغداد و کوفہ کی علمی درسگاہوں سے کسب فیض میں امام بخاری اکیسے نہیں تھے،
 بلکہ اطراف عالم کے محدثین کے قافلے در قافلے ان علمی مراکز سے علم کی پیاس بجھانے کے لئے بار بار چکر لگاتے رہے۔
 امام ابو داؤد کے صاحبزادے عبداللہ بن سلیمان بن الاشعث فرماتے ہیں:

دخلت الكوفة و اكتب عن ابى سعيد الاشج الف حديث فلما كان الشهر
حصل معى ثلاثين الف حديث

”میں کوفہ گیا اور ہر روز ابوسعید سے ایک ہزار حدیثیں پڑھ کر لکھتا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مہینے کے آخر
میں میرے پاس تیس ہزار احادیث کا مجموعہ تیار ہو گیا۔“

امام ابوداؤد کے باکمال صاحبزادے کے اس قول سے اندازہ لگا جاسکتا ہے کہ جب صرف ایک محدث کے پاس
روایات کی کثرت اتنی تھی کہ ایک مہینے میں ان سے تیس ہزار احادیث حاصل کیں، تو عراق کے بقیہ حفاظ حدیث کی
حدیث دانی کا کیا عالم ہوگا۔

امام انس بن سیرین کوفہ میں حدیث کی کثرت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اتيت الكوفة فرايت فيها اربعة الاف يطلبون الحديث و اربع مائة قد فقهوا
میں کوفہ آیا تو دیکھا کہ چار ہزار طالبان حدیث علم حدیث کی تحصیل میں مصروف تھے اور چار سو مکمل فقیہ بن چکے تھے۔
اسی طرح معروف محدث عفان بن مسلم فرماتے ہیں:

فقد مننا الف حديث الكوفة فاقمنا اربعة اشهر، و لو اردنا ان نكتب الف مائة
حدیث لکتبنا بها، فما کتبنا الا خمسين

”ہم کوفہ آئے، اور وہاں چار مہینے قیام کیا، اگر ہم چاہتے تو اس مدت میں ایک لاکھ احادیث لکھ سکتے تھے
، لیکن ہم نے اس عرصے میں پچاس ہزار روایات لکھیں۔“

اگر عراق کے صرف ایک خطے میں چار ماہ کی قلیل مدت میں طالبان حدیث ایک لاکھ تک روایات جمع کر سکتے تھے تو
بقیہ خطوں کو ملانے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ روایات و احادیث کی کثرت کا کیا عالم ہوگا؟
کیا معروف محدثین کے ان بیانات کے بعد یہ دعویٰ کرنا صحیح ہوگا کہ عراق میں احادیث کی قلت تھی؟ عجیب بات
ہے کہ عراق میں قلت حدیث کے مدعی حضرات نے اپنے اس دعوے پر دو مرتبہ تابعین و تبع تابعین کے کسی قابل ذکر
محدث کا قول ذکر نہیں کیا ہے۔

۴۔ معاصر تحریرات میں عراق میں قلت حدیث کی وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ عراق مرکز
اسلام یعنی حرمین شریفین سے دور تھا، اس لئے وہاں حدیث و روایات کافی کم تعداد میں تھیں، حالانکہ تاریخی طور پر یہ
بات مسلم ہے صحابہ کی ایک کثیر تعداد نے عراق خصوصاً کوفہ کو مسکن بنایا، کیونکہ کوفہ شہر کو چھاونی کے طور پر حضرت عمر رضی
اللہ عنہ نے بڑے اہتمام سے آباد کیا تھا، حضرت عمر کے اس اہتمام اور دلچسپی کا نتیجہ تھا کہ اکابر صحابہ جو قریب عراق
منتقل ہوتے گئے، خلافت مرتضوی کے زمانے میں جب کوفہ مملکت اسلام کا دار الحکومت بنا، اور کوفہ میں باب العلم حضرت
علی نے دربار خلافت سجایا تو دار الحکومت ہونے کی بنا پر حرمین شریفین اور دیگر خطوں سے ایک خلق کثیر نے کوفہ میں سکونت
اختیار کی۔ چنانچہ محدثین کی تصریحات کے مطابق کوفہ میں ۷۰ ہجری صحابہ، سات سو بیعت رضوان میں شریک ہونے
والے اصحاب اور مجموعی طور پر تقریباً پندرہ سو صحابہ نے کوفہ کو اپنا مسکن بنایا، صحابہ کے بعد تابعین اور تبع تابعین کی تعداد تو
اس کہیں زیادہ بن جاتی ہے۔ اگر اس کے ساتھ عراق کے دو سے قابل ذکر شہروں میں مکین صحابہ و تابعین کو شمار کر لیا

جائے تو بلاشبہ یہ تعداد ہزاروں تک پہنچ جاتی ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر شرف محمود محمد سلمان لکھتے ہیں:

نزل الكوفة عدد كبير جدا من الصحابة، فقد كان جيش سعد بن ابى وقاص اربعين الفا، وهم الذين سكنوا الكوفة اول ما اسست، ولا شك ان آلافا من هؤلاء من الصحابة

”کوفہ میں بہت بڑی تعداد میں صحابہ نے اقامت اختیار کی، کوفہ کی تاسیس کے وقت حضرت سعد بن ابی وقاص کے جس لشکر نے سب سے پہلے یہاں سکونت اختیار کی تھی، اس لشکر کی تعداد چالیس ہزار تھی، بلاشبہ اس لشکر میں صحابہ ہزاروں کی تعداد میں تھے۔“

اور یہ بات تو یقینی ہے کہ صحابہ کو نکال کر باقی سب تابعین یا تبع تابعین تھے۔ ہزاروں کی تعداد میں صحابہ و تابعین کا عراق کو مسکن بنانے کے بعد عراق میں قلت حدیث کے دعوے کی علمی و تاریخی حیثیت اہل علم پر مخفی نہیں ہے۔

چنانچہ ان وجوہات کی بنا پر مصطفیٰ احمد الزرقاء لکھتے ہیں:

وهذه الحقيقة تتنافى مع ظن قلة الحديث فى العراق

ترجمہ: یہ حقیقت (عراق میں صحابہ کی کثرت) عراق میں قلت حدیث کے دعویٰ کے منافی ہے۔

ایک تاریخی اشکال اور اس کا جواب

اس موقع پر ایک تاریخی اشکال کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مورخین کی تصریحات کے مطابق عراق میں صحابہ کی کثیر تعداد نے سکونت اختیار کی، لیکن تواریخ اور خاص طور پر کتب رجال میں ان صحابہ کے ناموں کی اگر تحقیق کر لی جائے تو چند سو سے زیادہ نہیں ملتے، چنانچہ اس حوالے سے الڈاکٹر شرف محمود محمد سلیمان نے اپنے ضخیم مقالے "مدرسة الحديث فى الكوفة" میں متعدد کتب رجال سے صرف تقریباً تین سو تیس (۳۲۰) کے قریب نام اکٹھے کیے، اگر بغداد و بصرہ کو ساتھ شامل کر لیا جائے تو ہزار سے زیادہ یہ تعداد نہیں بنتی، تو صرف چند سو ناموں کی موجودگی یہ دعویٰ کرنا کہ عراق میں مقیم صحابہ کی تعداد کافی زیادہ تھی، محل نظر ہے؟ اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ محدثین و مورخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ صحابہ کی تعداد ایک لاکھ سے زائد تھی، لیکن صحابہ کے حالات پر مشتمل سب سے ضخیم کتاب "الاصابہ" میں موجود تراجم کی تعداد تقریباً بارہ ہزار دو سو ستانوے ہیں۔ باقی کتب کے اضافی تراجم کو شامل بھی کر لیا جائے تو پندرہ ہزار سے زائد تعداد نہیں بنتی۔ نیز ان کتب میں بھی صحابہ کی ایک بڑی تعداد کے بلاد سکونت و دفن کا ذکر موجود نہیں ہے۔ ان عوامل کی بنیاد پر عراق میں موجود صحابہ کے نام زیادہ نہیں ملتے، اس لئے اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ واقع میں شاید تعداد اس کے قریب قریب ہو، درست نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محدثین ان محدود ناموں کے باوجود عراق میں موجود صحابہ کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ذکر کرتے ہیں۔ جیسا کہ اس کی تفصیل پیچھے ذکر ہو چکی ہے۔ لہذا محض ناموں کی بنیاد پر فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کہ فلاں شہر میں سکونت اختیار کرنے والے صحابہ کی تعداد حقیقت میں بھی مذکورہ ناموں کے قریب قریب ہوگی۔ کیونکہ اس طرح سے تو خود صحابہ کی مجموعی تعداد صرف چند ہزار رہ جاتی ہے، جبکہ تمام مورخین و محدثین کا اتفاق ہے کہ کم از کم ایک لاکھ تک تو تعداد ضرور پہنچتی ہے۔

(جاری)